© rasailojaraid.com



# اسلام کا معروضی مطالعہ! کیوں اور کیسے؟

سعید احمد اکبر آبادی۔

اب سے سوا دو برس پہلے دار المصنفین اعظم گڑھ کی دعوت
پر اسلامک اسٹیڈیز کانفرنس کا جو جلسہ اعظم گڈھ میں ہوا تھا۔ یہ مقالہ
اس کے لیے لکھا گیا تھا ——— (سعید احمد)

تاریخ مذاہبِ عالم کا یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ جب کبھی کوئی ایک مذہب عالمِ وجود میں آیا ہے۔ تو اس نے لوگوں میں خدا پرستی اور نیکی و پرہیزگاری کی زندگی بسر کرنے کا ایک جذبہ و داعیہ پیدا کر کے ایک سوسائٹی کی تشکیل و تعمیر کی ہے اور اس سوسائٹی نے نشو و ارتقا کے مختلف مدارج اور مراحل سے گزر کر ایک تاریخ کو جنم دیا ہے۔ لیکن اسی تاریخ نے آگے بڑھ کر پیروانِ مذہب کی آئندہ نسلوں کو اس درجہ متاثر اور منفعل کیا ہے کہ مذہب کے اصل سرچشمے اور اس کے حقیقی ماخذ اس کے سامنے ماند پڑ گئے ہیں یعنی اب مذہبی معاملات و مسائل کے جو فیصلے ہوتے ہیں۔ اُن کی اصل بنیاد وہ روایات اور وہ افکار و نظریات قرار پاتے ہیں جن کو تاریخ نے مختلف فضا اور ماحول میں پیدا کیا تھا۔ اور اسی بنا پر یہی روایات اور افکار و نظرات مذہب کی تشریح و توضیح کا معیار بن جاتی ہیں۔

غور کیجیے تو اسلام بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں رہا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اسلام کا ظہور مکہ میں ہوا اور ۲۳ برس کے مسلسل سفر کے بعد مدینہ میں اس کی تکمیل ہو گئی اور الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی کے اعلانِ ربانی نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اس مدت میں عقائد، عبادات اور معاملات سے متعلق ہزاروں مسائل و معاملات پیش آئے، اور ان سب کا حل وحی



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



متلو یا غیر متلو کے ذریعہ میسر آگیا اس زمانہ میں اختلاف و افتراق کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت موجود تھی۔ اور آپ کے متعلق فرمانِ الٰہی یہ تھا کہ وما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب عہدِ صحابہ شروع ہوا۔ تو اب اختلافات کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ کیونکہ ایک طرف اسلام کی تعلیمات اس درجہ ہمہ گیر تھیں کہ زندگی کا کوئی شعبہ ان کے احاطہ سے باہر نہیں تھا۔ اور دوسری جانب تمام صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فیضِ تعلیم و تربیت حاصل کرنے میں اور استعداد فہم و ذکاوت میں یکساں نہیں تھے۔ کسی نے ایک آیت سُنی اور اس کا جو مطلب حضور سے سن کر یا آپ سے سُنے بغیر جو کچھ اس کا مطلب سمجھا اُسے بیان کر دیا۔ حضور کا کوئی قول سُنا یا کوئی عمل دیکھا اسے روایت کر دیا۔ کسی اور صحابی نے کوئی اور قول سنا یا پہلے عمل کے خلاف کوئی اور عمل دیکھا۔ انہوں نے اسے نقل کر دیا بعضوں نے حضور کے دو قول سُنے اور مختلف اوقات میں دو مختلف عمل دیکھے تھے۔ انہوں نے ان دونوں کو بیان کر دیا۔ پھر جب نئے مسائل و معاملات پیدا ہوئے۔ اور ان کے لیے استنباط و استخراج کی ضرورت پیش آئی۔ تو جس صحابی کے پاس حضور کے قول و عمل کا جو سرمایہ محفوظ تھا۔ اور اسے انہوں نے جیسا کچھ سمجھا تھا۔ اس کی روشنی میں انہوں نے جدید امور و معاملات کی نسبت اپنی رائے ظاہر کر دی۔ اس طرح اب اختلاف اور احکام و مسائل میں تنوع رونما ہونے لگا لیکن یہ اختلاف سرتاسر رحمت تھا اور اس لیے دین کی وسعت سامانی کی بنیادیں استوار ہو رہی تھیں۔ اختلاف امتی رحمۃ کی روایت متکلم فیہا ہے جیسا کہ محققین کی رائے ہے۔ لیکن اگر یہ روایت صحیح ہے تو یقیناً اس کا مصداق وہی اختلاف ہے۔ جو علمی اور فکری طور پر قرن ثانی میں ظہور پذیر ہوا۔ چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا ارشاد گرامی ہے۔

> میں یہ نہیں چاہتا کہ صحابہ میں اختلاف رونما نہ ہوتا۔ کیونکہ اگر فروعی مسائل میں صحابہ کا ایک ہی قول ہوتا تو لوگوں کو اس سے بڑی تکلیف ہوتی۔ صحابہ کرام ائمہ دین تھے جن کی پیروی موجب خیر و برکت اور باعث فلاح نجاح ہے اس بنا پر اگر کوئی



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



شخص کسی بھی صحابی کے قول پر عمل کرے گا تو اسے سنت تصور کیا جائے گا۔[1]

اس عہد کے بعد دور تابعین میں اختلاف کا دائرہ اور وسیع ہوا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری قوموں اور ملکوں کے لوگ کثرت سے اسلام کے حلقہ بگوش ہو رہے تھے اور یہ ان ملکوں اور قوموں کے افراد تھے جن کے پاس اپنی تہذیب و ثقافت اور مذہبی افکار و نظریات کا عظیم سرمایہ محفوظ تھا۔ اب وہ دور تو تھا نہیں جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض نظر و صحبت سے عہد جاہلیت کی تمام آلائشیں دور ہو جاتی تھیں اور قلب و دماغ کا مکمل تزکیہ اور تنقیہ ہو جاتا تھا۔ اس بنا پر اس عہد میں عجمی ممالک کے جو لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے ان سے یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد وہ اپنے قومی مزاج اور طبیعت اور اس کے باعث خاص قسم کے میلانات و رجحانات سے یکسر پاک و صاف اور مبرّا و منزہ ہو جائیں گے۔ ایک طرف علمی ذہنی اور فکری سطح پر اس دور میں یہ تبدیلی پیدا ہو رہی تھی اور دوسری جانب خود عربوں میں سیاسی اختلافات اور قبائلی عصبیت نے شدت اختیار کر لی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت راشدہ کے اختتام کے بعد بنو امیہ کے دور حکومت میں اسلامی وحدتِ فکر اور بے لوث ذہنی اجتہاد و استنباط کی فضا اپنی اصل شکل و صورت میں قائم نہ رہ سکی۔ اس انتشار خیال اور پراگندگی فکر و نظر کے باعث متعدد مکاتبِ فکر ظہور پذیر ہوئے۔ اور ان مکاتب فکر کا دامن اتنا وسیع تھا کہ جزئی اور فروعی مسائل کے علاوہ اصولی اور عقائدی مسائل و مباحث۔ مثلاً صفات باری، خلقِ قرآن، جبر و قدر، ایمان اور عمل کا تعلق، خیر و شر کی حقیقت، مرتکب کبیرہ کا حکم وغیرہ۔ یہ سب چیزیں بھی موضوع بحث بن گئیں۔ اور اس بحث و جدال نے متعدد فرقوں کی صورت اختیار کر لی۔ اسی دور میں بعض سماجی سیاسی اور نفسیاتی عوامل و اسباب کے ماتحت ایک مخصوص طرز فکر و زندگی کی حیثیت سے تصوف بھی پیدا ہوا جو آگے چل کر ایک خاص طبقہ اور گروہ کی تشکیل کا باعث بنا۔

---

[1] الاعتصام الشاطبی ج ۳ ص ۱۱



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



فرقہ بندی کا خاصہ ہے کہ وہ ایک خاص قسم کا رجحان و میلان اور سوچنے و غور کرنے کا ایک خاص ڈھنگ پیدا کرتی ہے۔ حقیقت ایک ہوتی ہے لیکن ہر فرقہ کا شخص اس کی تعبیر اور تشریح و توضیح فرقہ وارانہ ذہن سے اپنے میلان و رجحان کے مطابق ہی کرتا ہے۔ اس بنا پر فرقے جتنے زیادہ ہوتے چلے جائیں گے ایک ہی حقیقت کی تعبیر و تشریح و توضیح میں اختلاف اور تنوع کا دائرہ وسیع تر ہوتا رہے گا۔ چنانچہ اسلام میں بھی یہی ہوا۔ قرآن ہر مسلمان کے عقیدے میں کتاب الٰہی اور اسلامی احکام و مسائل کا اوّلین ماخذ اور اصل سرچشمہ ہے لیکن اس کے فہم و ادراک معانی کی بات کہاں سے کہاں پہنچی اس کا اندازہ گولڈزیہر کی کتاب جس کا عربی میں ترجمہ مذاهب التفسير الاسلامی کے نام سے عرصہ ہوا قاہرہ سے شائع ہو چکا ہے۔ اور مصر کے فاضل محمد حسین الذہبی کی کتاب التفسیر والمفسرون کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ ان دو کتابوں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ ان کے مصنفوں نے مطبوعہ تفاسیر کے علاوہ بہت سی ایسی تفسیروں کا بھی مطالعہ کیا ہے جو اب تک محض مخطوطات کی صورت میں کہیں کہیں محفوظ ہیں۔ بہر حال تفاسیر کا جو مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے اگر ان پر ہی ایک نگاہ ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ تفسیر میں جو رجحانات پائے جاتے ہیں انھیں مندرجہ ذیل اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ تفسیر بالماثور :- یعنی قرآن کی تفسیر احادیث و آثار کی روشنی میں کرنا۔

۲۔ تفسیر بالرائے والاجتہاد

۳۔ لغوی رجحان ——— ۴۔ قصصی رجحان

۵۔ فقہی رجحان ——— ۶۔ باطنی رجحان :- اس سے اشارہ ان تفاسیر کی طرف ہے جو فرقۃ الامامیۃ الاسماعیلیہ کے علما کی لکھی ہوئی ہیں۔ یہ فرقہ شیعہ امامیہ کی ایک انتہا پسند اور غالی شاخ ہے اس کی نسبت اسماعیل بن جعفر صادق کی طرف ہے اور یہ صرف قرآن کے باطنی کا قائل ہے۔

۷۔ صوفیانہ یا اشاری رجحان :- باطنی اور صوفیانہ اشارات کو بعض حضرات ایک ہی چیز سمجھے



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ہیں لیکن درحقیقت ان دونوں میں فرق ہے اگرچہ شیخ محی الدین ابن عربی کی تفسیر میں کہیں کہیں دونوں کی حدیں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ صوفیانہ رجحان ان چیزوں کا منکر نہیں ہوتا جو ظاہر قرآن سے مفہوم ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس باطنی رجحان صرف ان چیزوں کو قرآن کی مراد اور مطلب قرار دیتا ہے۔ جو آیات کے باطن سے مفہوم ہوتی ہیں۔

صوفیانہ رجحان کی تفسیر کے غالباً اولین نمائندہ ابو محمد سہل بن عبداللہ بن یونس بن عیسیٰ بن عبداللہ التستری، المتوفی ۲۸۳ھ ہیں۔ اکابر عارفین و صوفیا میں شمار ہوتا ہے انہوں نے لکھا ہے۔ قرآن کی ہر آیت چار چیزوں پر مشتمل ہے۔ ظاہر، باطن، حد اور مطلع۔ ظاہر تلاوت آیات کا نام ہے۔ باطن اس کا فہم ہے۔ اور حد اس کی تحلیل و تحریم۔ اب رہا مطلع تو وہ یہ ہے کہ قاری کا قلب راہ خداوندی تک پہونچ جائے اور اس سے عبرت پذیر ہو [1]۔

۸۔ عقلی اور فلسفیانہ رجحان:۔ اس رجحان کی نمائندگی دو قسم کے حضرات کرتے ہیں۔ ایک متکلمین اور دوسرے فلاسفہ۔ پہلے طبقہ کے سب سے بڑے ترجمان امام فخرالدین رازی المتوفی ۶۰۶ھ ہیں ابونصر فارابی متوفی ۳۳۹ھ کی بعض وہ تفسیری تشریحات ہیں جو "فصوص الحکم" میں موجود ہیں یا شیخ بو علی بن سینا متوفی ۴۲۸ھ کی سورہ اخلاص اور معوذتین کی تفسیر میں یا بعض رسائل اس دوسرے طبقہ کے تفسیری رجحان کا مظہر ہیں، پھر انھیں فلاسفہ میں ایک اور طبقہ ہے جو انتہا پسند ہے۔ اس کی نمائندگی اخوان الصفا کرتے ہیں جن کے رسائل میں تفسیری مباحث جا بجا پھیلے ہوئے ہیں۔

۹۔ کلامی یا فرقہ وارانہ رجحان۔ اس رجحان کی عظیم نمائندہ وہ تفسیریں ہیں جو شیعہ یعنی امامیہ، اسماعیلیہ، زیدیہ، خوارج یا معتزلہ سے تعلق رکھنے والے حضرات نے لکھی ہیں۔ شیعہ تفاسیر کے جائزہ اور مفصل علم کے لیے ایران کے نامور محقق اور فاضل آغا بزرگ الطہرانی کی کتاب "الذریعہ الی تصانیف الشیعہ" دیکھنی چاہیئے۔ جو متعدد ضخیم مجلدات پر مشتمل ہے۔ اس طرز تفسیر کا آغاز پہلی صدی کے اواخر میں ہی ہو گیا تھا چنانچہ سب سے پہلی تفسیر جابر الجعفی متوفی ۱۲۸ھ کی۔

---

[1] تستری ص ۳



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



بیان کی جاتی ہے جواب دستیاب نہیں ہے۔ اس کے بعد تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں اس طرز پر کثرت سے تفسیریں لکھی گئیں۔ ان تفاسیر کا انداز اگرچہ تفسیر بالماثور کا ہے۔ لیکن یا یں شیعہ عقاید و مسلک کی ترجمان کیونکہ ان میں خاص قسم کی روایات ہیں جن کا سلسلۂ اسناد اہل بیت اور ان سے تعلق رکھنے والے بزرگوں تک پہونچتا ہے یہ امامیہ اثنا عشریہ کی تفاسیر کا حال ہے زیدیہ فرقہ جو حضرت زید بن علی سے منسوب ہے اُن کی تفاسیر میں معتزلی رجحان پایا جاتا ہے کہتے ہیں کہ حضرت زید بن علی کو واصل بن عطا سے تلمذ کی نسبت تھی۔ زیدیہ فرقہ کی تفاسیر شیعہ فرقوں میں اہل سنت کی تفاسیر سے زیادہ قریب ہیں کیونکہ ان میں مقابلۃً توازن اور اعتدال زیادہ ہے۔ یہ فرقہ حضرت علی کی افضلیت کا قائل ہے لیکن شیخین کی خلافت کو جائز تسلیم کرتا ہے[1]

خوارج کا ذخیرہ تفاسیر محدود ہے۔ تاہم ان کی مشہور کتابیں یہ ہیں۔ (۱) تفسیر عبدالرحمٰن بن رستم الفارسی جو تیسری صدی ہجری کے آدمی ہیں۔ (۲) تفسیر ہود بن محکم الہواری یہ بھی تیسری صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور (۳) تفسیر ابو یعقوب یوسف بن ابراہیم الورجلانی متوفی ۵۷۰ھ ان سب تفاسیر میں آیاتِ قرآنی سے خوارج کے معتقدات اور ان کے مسلک کا اثبات کیا گیا ہے۔ اس میدان میں معتزلہ کیوں کسی سے پیچھے رہتے۔ چنانچہ خود اس فرقہ کے بانی واصل بن عطاء متوفی ۱۳۱ھ نے خود ایک تفسیر معانی القرآن کے نام سے لکھی اور اس کے بعد اسی نقطۂ نظر سے یعنی مسلکِ اعتزال کی تائید و توثیق کے لیے ابو علی الجبائی متوفی ۳۰۳ھ۔ اور ابو ہاشم الجبائی متوفی ۳۲۱ھ جو اعتزال کے ستون سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے تفسیریں لکھیں۔ لیکن یہ اب نایاب ہیں لیکن قاضی القضاۃ عبدالجبار اسدآبادی متوفی ۴۱۵ھ کی تفسیر تنزیہ القرآن عن المطاعن اور شریف مرتضیٰ متوفی ۴۳۶ھ کی تفسیر امالی الشریف المرتضیٰ یا غرر الفوائد و درر القلائد کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ ابومسلم محمد بن بحر الاصفہانی کی تفسیر اب اگرچہ نہیں ملتی۔ تاہم امام رازی

---

[1] مقالات الاسلامیین ابوالحسن اشعری ص ۶۵، ۶۸، ۶۹، والملل والنحل شہرستانی ج ۱ ص ۲۴۲، ۲۴۳



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



جابجا اس تفسیر کو نقل کرتے اور مصنف کی وقتِ نظر کی داد دیتے ہیں۔ معتزلی مسلک کی آج سب سے بڑی اور نہایت اہم تفسیر وہ ہے جس کو عربی کا ہر طالب علم تفسیر الکشاف کے نام سے جانتا ہے۔

اب تک ہم نے تفسیر میں نو قسم کے رجحانات کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ہمارا موجودہ زمانہ سائنسی علومِ جدیدہ اور سیاسی افکار و آراء کی غیر معمولی ترقی اور ان کے عروج کا زمانہ ہے اس بنا پر کیونکر ممکن ہے کہ اس عہد کے علمی اور سیاسی نظریات و افکار کا اثر فنِ تفسیر پر نہ ہوتا۔ چنانچہ جوہر طنطاوی کی تفسیر جواہر القرآن پر سائنس اور اس کے علوم کا اثر پایا جاتا ہے۔ مفتی محمد عبدہ اور سید رشید رضا کی تفسیر المنار جدید سماجی علوم اور ان کے پیدا کیے ہوئے فکرِ نو سے متاثر ہے اور مولانا عبیداللہ سندھی کی تفسیری کاوشوں پر جدید سیاسی افکار و آراء کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ مذکورۂ بالا رجحانات میں سب سے اعلیٰ اور اشرف اور قرآن سے قرین رجحان نمبر ایک یعنی تفسیر بالماثور ہے۔ کیونکہ قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اور آپ ہی کا منصب اس کی تبیین ہے۔ اس طرزِ تفسیر کا سب سے بڑا مظہر تفسیر ابن جریر طبری۔ متوفی ۳۱۰ھ ہے۔ اس کے بعد معالم التنزیل للبغوی اور زاد المسیر لابن الجوزی بھی اسی ذیل میں آتی ہیں۔ لیکن محققین علماء نے تفسیر بالماثور کی خامیاں اور کمزوریاں حسبِ ذیل بیان کی ہیں۔ (۱) وضعی اور جعلی روایات کی کثرت! ان روایات کے باعث تفسیر کا فن خود کتنا بدنام ہوگیا ہے۔ اس کا اندازہ امام احمد بن حنبل کے اس مشہور قول سے ہو سکتا ہے۔ ثلاثة ليس لها اصل : التفسير والملاحم والمغازی[1]

(۲) اسرائیلیات کی بھرمار۔ اور (۳) حذفِ اسناد : عہدِ صحابہ میں اسناد کے بارہ میں کچھ زیادہ تشدد نہیں برتا جاتا تھا۔ البتہ حضرت عمرؓ گواہ ضرور طلب کرتے تھے۔ لیکن عہدِ عثمانی کے فتنہ کے بعد اسناد کا مطالبہ سختی سے ہونے لگا۔ تابعین اور تبع تابعین کے دور میں یہی صورتِ حال قائم

---

[1] الاتقان ج ۲ ص ۲۱۱۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



دیکھا چنانچہ اس دور میں جو تفسیریں لکھی گئیں مثلاً تفسیر سفیان بن عیینہ۔ اور تفسیر وکیع بن الجراح ان میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔ لیکن اس عہد کے بعد جو مفسرین آئے انہوں نے عام طور پر اسانید کو حذف کرنا شروع کر دیا۔ اور اس راہ سے بے شمار جعلی اقوال تفسیر بالماثور میں اس طرح داخل ہو گئے کہ صحیح اور غیر صحیح۔ ضعیف اور موضوع کا پہچاننا سخت سے مشکل ہو گیا۔

جب تفسیر بالماثور جس کا رواج عہد صحابہ و تابعین میں تھا اس کی بے اعتباری کا یہ عالم ہے تو پھر اس کے علاوہ جو تفسیری رجحان اوپر بیان کئے گئے ہیں۔ ان کی روشنی میں جو تفسیری کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان کا پایۂ اعتبار کس درجہ کا ہو سکتا ہے؛ وہ ظاہر ہے: چنانچہ احمد امین فجر الاسلام میں لکھتے ہیں۔ عہد صحابہ و تابعین کے بعد جو دور آیا اور اس میں جبر و قدر وغیرہ ایسے مباحث پیدا ہوئے تو تفسیروں کا حال یہ ہو گیا کہ ہر مفسر جس عقیدہ و خیال کا ہوتا تھا۔ وہ قرآن کی تفسیر اس کے ہی مطابق کرتا تھا۔ [1] احمد امین تو عہد جدید کے آدمی ہیں ان سے بہت پہلے ابن قتیبہ نے تاویل مختلف الحدیث [2] میں متکلمین کے متعلق لکھا تھا۔ وفسروا القرآن باعجب تفسیر یریدوا

ان یردوہ الی مذاھبھم ویحملوا الناس علی غلطھم

مفتی محمد عبدہٗ لکھتے ہیں

تفسیر جو ہماری مطلوب ہے وہ دراصل یہ ہے کہ کتاب اللہ کو اس طرح پر سمجھا جائے کہ وہ لوگوں کے لیے ان کی دنیوی اور اخروی دونوں زندگیوں میں فلاح وسعادت کو باعث بنے۔ بس قرآن کا یہی مقصد اعلیٰ ہے۔ باقی اس کے علاوہ اور جو کچھ بھی ہے وہ اس کے تابع ہے یا اس کے حاصل کرنے کا وسیلہ ہے۔" [3]

اس کے بعد لکھتے ہیں۔

قرآن مجید ایک ترازو ہے جس میں ہم کو اپنے عقائد [illegible]

---

[1] فجر الاسلام ص ۲۰۶ ۔ [2] تاویل مختلف الحدیث ص ۸۸ [3] تفسیر المنار ج ۱ ص ۱۸



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ترلنے چاہئیں۔ اگر ہم بغیر کسی تحفظات ذہنی و دماغی (Mental Reservations) کے قرآن میں تدبر اور غور و فکر کریں گے تو ہدایت یاب ہوں گے۔ ورنہ گمراہ ہو جائیں گے۔ اور اسی وجہ سے فرمایا گیا ہے۔ "القرآن حجۃ لک او علیک" اور اسی وجہ سے اس کو "ہدی للمتقین" کہا گیا ہے۔

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا وہ تفسیر قرآن سے متعلق تھا۔ اب حدیث کو لیجیے تو بعض روایات سے مترشح ہوتا ہے کہ عہدِ صحابہ میں ہی کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی چیز کی روایت اور نقل میں کچھ زیادہ محتاط نہیں تھے۔ اور یہ کوئی امر مستبعد بھی نہیں تھا۔ کیونکہ کسی بھی اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائٹی میں فکر و نظر عمل و کردار اور اخلاق و شمائل کے اعتبار سے سب لوگ یکساں نہیں ہوتے۔ اور حکم ہمیشہ اکثریت پر ہوتا ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں روایت ہے کہ۔۔ بشیر العدوی نامی ایک شخص حضرت عبداللہؓ بن عباس کی خدمت میں آئے اور قال رسول اللہ کہہ کر روایت بیان کرنی شروع کی۔ لیکن حضرت ابن عباس نے اس پر کوئی توجہ نہیں کی۔ بشیر نے کہا: حضرت! میں آپ کے سامنے رسول اللہ کی حدیث بیان کر رہا ہوں اور آپ اسے سنتے تک نہیں ہیں۔ اس پر حضرت ابن عباس نے فرمایا: ایک زمانہ تھا جب ہم سے کوئی شخص قال رسول اللہ کہتا تھا تو ہم اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جاتے تھے۔ لیکن جب سے لوگوں پر شدائد اور لوازل کا نزول ہوا ہے ہم محتاط ہو گئے ہیں اور اب ہم صرف انھیں روایات کو قبول کرتے ہیں جنھیں ہم پہچانتے ہیں۔ اسی طرح سفیان بن عیینہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہؓ بن عباس کی خدمت میں ایک تحریر پیش کی گئی جس میں حضرت علی کا کوئی فیصلہ لکھا ہوا تھا۔ حضرت ابن عباس نے اُسے دیکھا تو اس کے ایک حصہ کو مٹا دیا۔ یہ صورتِ حال عہدِ صحابہ میں تھی۔ لیکن جب اسلام کا دائرہ فتوحات وسیع ہوا اور اب دوسری قوموں اور ملکوں کے لوگ جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہو کر مسلم معاشرہ میں گھل مل گئے تو اب بعض لوگوں نے اپنے خاص مقاصد کے پیش نظر وضع حدیث کو پیشہ بنا لیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو قرآن کے ارشاد "ولما یدخل الایمان فی قلوبکم" کے مصداق تھے۔ یا وہ منافقین ہیں اس لیے ہوتے تھے کہ اپنی ریشہ دوانی سے اسلام کی ملیا (میٹ کر دیں)۔



© rasailojaraid.com

رخنے پیدا کریں۔ چنانچہ ابن عدی کا بیان ہے کہ جب عبدالکریم بن ابی العوجاء الوضاع کو قتل کرنے کی غرض سے گرفتار کیا گیا تو اس نے کہا کہ لقد وضعت فیکم اربعة آلاف حدیث احرّم فیہا و احلل۔ ؎ یہ شخص معن بن زائدہ کا ماموں تھا۔ اور اس پر مانوی مذہب کی پیروی کا الزام تھا۔ یہ وضع حدیث کا فتنہ کس درجہ شدید تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ امام بخاری نے اپنے زمانہ کی رواج یافتہ چھ لاکھ حدیثوں میں سے صرف سات ہزار حدیثوں کا انتخاب فرمایا جو ان کے نزدیک صحیح تھیں۔ اور ان سات ہزار حدیثوں میں بھی تین ہزار حدیثیں مکرر ہیں اس وضع کے اسباب ایک دو نہیں بلکہ چند در چند تھے جو ارباب علم و تحقیق پر مخفی نہیں اور یہاں ان کو بیان کرنے کی نہ ضرورت ہے اور نہ موقع۔ پھر جیسا کہ معلوم ہے بعض اوقات وضع حدیث کی غرض ترغیب یا ترہیب بھی ہوتی تھی۔ اور بعض حضرات اس کو ناجائز نہیں جانتے تھے۔ ان عام موضوع روایات کے علاوہ اسرائیلیات کے نام سے روایات کا ایک مستقل ذخیرہ تھا۔ جو عہد صحابہ سے منتقل ہو کر عہد بعہد چلا آرہا تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محدثین کرام کی ایک جماعت نے تغمدھم اللہ بانوار رحمتہ و برد مضجعہم وقت کے اس عظیم فتنہ کا بڑی جرأت و ہمت، طاقت و قوت اور بالغ نظری سے مقابلہ کیا۔ انہوں نے نقد حدیث اور جرح و تعدیل کے اصول متعین کیے۔ اسماء و رجال پر کثرت سے کتابیں لکھیں اور حضرت اسحاق بن راہویہ کے بقول ان لوگوں تک کی روایات رد کردیں جن کی روحیں جنت میں سبز لباس میں ملبوس ہوں گی۔ یہ بلا شبہ ایک نہایت عظیم کارنامہ ہے جس سے ان حضرات نے دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کر دیا۔ اسلام اور مسلمان دونوں پر ان علماء کا یہ عظیم احسان ہے جسے نہ فراموش کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ اس کی بے وقعتی کی جا سکتی ہے لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ محدثین بھی سب بخاری اور مسلم نہیں تھے۔ اور آج حدیث کا عظیم و وسیع ذخیرہ صرف صحیحین یا صحاح ستہ یا موطا امام مالک پر ہی مشتمل نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ صحیح ضعیف اور موضوع احادیث کی تحقیق و تنقیح [illegible] لیکن ضعیف

© rasailojaraid.com



وضعیہ اور موضوع احادیث دنیا سے ناپید نہیں ہوئیں۔ اور وہ ہمارے اسلامی لٹریچر کا جزو بن گئیں۔ اور تفسیر، وعظ و تذکیر۔ تذکرہ و تاریخ اور معرفت و تصوف کی کتابوں میں علاوہ کتبِ حدیث کے پھیلی ہوئی ہیں۔ فرقہ بندی حبک الشئی یعمی ویصمّ کے مطابق انسان کو ہر اس چیز سے استدلال کرنے پر مجبور کر دیتی ہے جس سے اس فرقہ کے مزعومات یا معتقدات کی توثیق ہوتی ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابن جوزی اور ملا علی قاری نے جن روایات کو اپنے تذکرہ الموضوعات میں شائع کیا ہے ان میں سے کتنی روایات ہیں جن کو مختلف فرقوں کے حضرات علماء نے بطور دلیل استعمال کیا اور ان پر اپنے مسلک کی تعمیر کھڑی کی ہے۔ علاوہ ازیں کتنی ہی موضوع روایات ہیں۔ جو زبان زد خلائق بن گئی ہیں۔ اور اچھے اچھے ثقہ عالم اپنی تحریروں اور تقریروں میں ان سے کام لیتے ہیں۔ روایات کا عموم و شیوع قوم کے مزاج اور طبیعت پر شعوری یا نیم شعوری طور پر لازماً اثر انداز ہوتا ہے۔ اور مزاج اور طبیعت جب اثر پذیر ہوتے ہیں تو فکر و ذہن اور نتیجۃً عمل اور اخلاق کا متاثر ہونا ایک امر ناگزیر ہے۔ روایات اگر صحیح درست اور مضبوط اور توانا ہوں گی تو ان کا اثر بھی ایسا ہی ہوگا اور اگر وہ سقیم، مجروح کمزور اور ضعیف ہوں گی تو ان کا اثر بھی ناخوشگوار ہوگا۔

حدیث کے بعد اب فقہ پر ایک نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ فقہ کے ماخذ بنیادی طور پر چار ہیں۔ جو اوپر لکھے جا چکے ہیں۔ اور وہ ہیں۔ کتاب، سنت، اجماع اور قیاس اور ان چاروں میں اختلاف کا پیدا ہونا ناگزیر ہے کتاب یعنی قرآن میں عام خاص، مطلق، مقید، مشترک ظاہر، نص، مفسر، محکم، خفی، مشکل، مجمل، متشابہ وغیرہ الفاظ و عبارات کی قسمیں ہیں۔ اس بنا پر ایک مجتہد قرآن کے ایک لفظ کو عام سمجھتا ہے اور دوسرے کے نزدیک وہ خاص ہے ایک کے نزدیک ایک حکم مطلق ہے اور دوسرے خیال میں مقید اور اگر دونوں کے نزدیک مقید ہی ہے تو پھر اختلاف اس بات میں کہ قید کیا ہے یا اتفاق... اصل فقہ کی کتابیں پڑھ جائیے سب اس نوع کے اختلافات سے پر ہیں علاوہ ازیں قرآن مجید کے کسی ایک لفظ یا کسی ایک عبارت کے معنی مفہوم اور مصداق متعین کرنے کیلئے مجتہد کبھی سنت سے کام لیتا ہے ——



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کبھی اجماع سے اور کبھی قیاس سے ۔ سنت میں احادیث اور آثارِ صحابہ دونوں شامل ہیں۔ اور احادیث کا اطلاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور افعال یا آپ کے سامنے کوئی فعل کیا گیا اور اس پر آپ نے اظہار پسندیدگی یا ناپسندیدگی فرمایا۔ ان سب پر ہوتا ہے ۔ اور ان سب میں جو تنوع ہے وہ حدیث کے ہر طالب علم کو معلوم ہے۔ اس کے علاوہ اگر صرف ایک ہی حدیث ہے اور اس کے معارض کوئی دوسری حدیث یا اثر نہیں ہے۔ تب بھی دو مجتہدوں میں اختلاف اس بات پر ہوسکتا ہے کہ ایک کے نزدیک حدیث میں حضور کا جو فعل یا قول بیان کیا گیا ہے وہ مطلق اور عام ہے اور دوسرے کے خیال میں مقید اور مبنی بر علت و مصلحت خاص ہے اس بنا پر قرآن کے کسی لفظ یا آیت کا مفہوم متعین کرنے میں جب سنت سے مدد لی جاتی ہے۔ تو اس میں بھی اختلاف کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اب اجماع کو دیکھیے! تو ظاہر ہے جزئی اور فروعی مسائل میں اجماعِ تام تو مشکل سے ہوسکتا ہے۔ البتہ اجماع ناقص ہوگا مثلاً علمائے حجاز کسی ایک بات پر متفق ہوں گے اور علمائے عراق کسی اور پر۔ اور علمائے ماوراء النہر کا اتفاق کسی اور چیز پر۔ اور پھر ان میں سے ہر گروہ کے وجوہ اتفاق اور مسئلہ کے دلائل و براہین الگ الگ ہوں گے۔ بہرحال اس صورت میں بھی اختلاف کا دروازہ کھلا ہی رہا۔ اگرچہ یہ اختلاف قرون اولیٰ میں الدین یسر اور اسلام کے عالمگیر مذہب ہونے کی بنا پر ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ امام مالک بن انس کا مشہور واقعہ ہے کہ جب خلیفۂ وقت (منصور یا ہارون رشید) نے ان سے اپنی یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ المدونۃ الکبریٰ کو خانہ کعبہ میں آویزاں کرکے یہ اعلان کرنا چاہتا ہے۔ کہ تمام ممالک محروسۂ اسلامیہ میں فقہ مالکی پر عمل کیا جائے تو امام عالی مقام نے خلیفہ کو ایسا کرنے سے منع فرمادیا۔ اور اس کی وجہ یہ قرار دی کہ ہم اہلِ حجاز ہیں۔ اور اس بنا پر دوسری قوموں سے الگ تھلگ ہیں۔ لیکن علمائے عراق کا واسطہ ان ملکوں سے ہے جہاں مختلف اقوام و ملل مختلفہ باہم دگر ملی جلی ہیں۔ اور اس بنا پر وہاں اس قسم کے جو مسائل اور معاملات پیدا ہوگئے ہیں ہم اہلِ حجاز ان سے ناآشنا ہیں۔ اس بنا پر وہ لوگ ہمارے فقہ پر عمل کرنے کے لیے کس طرح مجبور



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کیے جاسکتے ہیں۔

اب آخر میں قیاس کو لیجیے جسے ہم رائے بھی کہہ سکتے ہیں۔ قیاس میں ایک مقیس علیہ ہوتا ہے اور ایک وجہ قیاس۔ اس بنا پر اختلاف کا ہونا ناگزیر ہے کیونکہ جیسا کہ اصول فقہ کی کتابوں میں مفصل طور پر مذکور ہے جب ہم تحقیق مناط، تنقیح مناط اور تخریج مناط کے اصول پر عمل کرتے ہیں۔ تو بحث پھیلتی چلی جاتی ہے موضوع گفتگو کے کئی پہلو نکلتے چلے آتے ہیں اور کسی ایک چیز پر سب کا متفق ہونا ناممکن ہو جاتا ہے مثلاً حدیث حرمت ربوا سب کے سامنے ہے لیکن اس حرمت کی علت کیا ہے؟ تفاضل یا تجانس اور یا دونوں پھر یہ دونوں ہیں تو بر سبیل مانعۃ الجمع یا بر سبیل مانعۃ الخلو۔ اس سلسلہ میں جو طول طویل بحثیں ہیں وہ اہل علم پر مخفی نہیں ہیں۔

علاوہ بریں ایک مجتہد جب قیاس سے کام لیتا ہے تو اس کا قیاس صرف شرعی نہیں ہوتا۔ یعنی نصوص اور نظائر شرعیہ تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ بر بنائے لغت و قواعد بھی ہوتا ہے۔ مثلاً آیت عدت میں المطلقات یتربصن بانفسہن ثلاثۃ قروء جو فرمایا گیا ہے تو امام شافعی کے نزدیک قروء سے مراد طہر ہے۔ کیونکہ ثلاثۃ جب مونث ہے تو اس کی تمیز مذکر ہونی چاہیئے۔ اس کے برخلاف امام ابو حنیفہ کے ہاں اس سے مراد حیض ہے کیونکہ عدت کا جو مقصد ہے یعنی استبراء رحم وہ اسی سے حاصل ہوتا ہے۔ اور پھر ثلاثۃ کا لفظ ایک عدد معین پر دلالت کرتا ہے اور طہر کی صورت میں بسا اوقات پورے تین نہیں ہو سکتے۔ کم رہیں گے یا زیادہ اسی طرح قیاس کبھی عقلی بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ مدت رضاعت میں یہ اختلاف کہ وہ دو برس ہے یا ڈھائی برس۔ یا تین برس ظاہر کرتا ہے یا مثلاً یہ بات کہ امام شافعی کے نزدیک نکاح مثل بیع کے ہے۔ اور امام اعظم کے ہاں ایسا نہیں ہے اس ایک نقطۂ نظر میں اختلاف کے باعث کتنے مسائل اور احکام جزئیہ مختلف ہوتے چلے گئے ہیں۔ فقہ کی کتابوں میں ان کو دیکھا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں مجتہد کے اجتہاد اور استنباط میں عرف و عادت و مصالح عامہ اور احوال و ظروف زمانی و مکانی کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اور اس بنا پر ایک مجتہد کسی ایک مقام پر ایک بات کہتا ہے اور جب دوسری جگہ پہنچتا ہے تو پہلی بات سے رجوع کر لیتا ہے۔ چنانچہ جب امام شافعی



© rasailojaraid.com

جب مصر پہنچے تو اپنے متعدد فیصلوں سے رجوع کیا اور کبھی ایک ہی مقام پر رہتے ہوئے اپنے سابقہ فیصلوں کو واپس لے لیتا ہے چنانچہ متعدد مسائل ہیں جن سے امام اعظم ابوحنیفہ کا رجوع ثابت ہے بہرحال فقہ کے ان ماخذ اربعہ کے چند در چند وجوہ دہرایا ہیں جن کے باعث مکاتب فقہ چند در چند ہو گئے ہیں مورخین علماء نے ان کی تعداد انیس بتائی ہے جن میں سے چار مکاتب کو فروغ ہوا اور قبولِ عام کی سند نے انھیں مشہور کر دیا۔ باقی جو تھے وہ دستبرد زمانہ کا شکار ہو گئے۔ اگر آج وہ بھی ہوتے تو اندازہ ہو سکتا تھا کہ استنباط و استخراج احکام اور اجتہاد کی راہیں کس حد تک دسیع ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک اصولِ دین ارکانِ اسلام اور شریعت کی اساسی تعلیمات کا تعلق ہے اختلاف ان میں نہیں ہوا بلکہ فروعی اور جزئی مسائل میں اور بعض بنیادی تعلیمات سے متعلقہ امور کی تشریح و توضیح میں ہوا گویا تشبیہ کی زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن و حدیث دونوں کی حیثیت ایک متن کی تھی۔ اور متکلمین و محدثین اور فقہاء کی بحث و تمحیص کی حیثیت شرح و توضیح کی تھی۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے ان اختلافات کو اسی درجہ میں رکھا اور اس بنا پر ان میں وہ تحزب اور تشیع پیدا نہیں ہوا جو فکری اور عملی طور پر ان کو اسلام کی اصل تعلیمات اور قرآن و حدیث کے بنیادی تقاضوں اور مطالبات سے نیم شعوری یا غیر شعوری طور پر انحراف پر مجبور کر دے۔ لیکن زمانہ کے امتداد کے ساتھ اختلاف خلاف و نزاع کی شکل اختیار کرنے رہے۔ اور آخر نوبت بانیجا رسید کہ یہ اختلافات ہی اصل دین بن گئے یعنی قرآن و حدیث کا درس اب بھی ہوتا ہے۔ اور انھیں کو سرچشمۂ اسلام سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ہر فرقہ کو خواہ وہ کلامی ہو یا فقہی لیکن قرآن اور سارا ذخیرہ حدیث اسی کے معتقدات و معلومات سے بھرپور نظر آتے تھے۔

اقبال نے امت مرحومہ کے اسی مرض کو روایات میں کھو جانے سے تعبیر کیا ہے۔ ظاہر ہے یہ روایات۔ صحیح یا غیر صحیح وقت اور حالات کی پیداوار ہونے کے باعث ہنگامی تھیں اسی لئے ان میں ابدیت نہیں ہو سکتی تھی۔ اور ان سے فکر و نظر کو وہ روشنی نہیں مل سکتی تھی جو قرآن و سنت کا اولین مقصد تھا۔ جب فکر و نظر اس روشنی سے محروم ہو جائے تو پھر علم کی تازگی اور اخلاق و

کردار کی بلندی کی کیا توقع ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اقبال نے اس خسارۂ فکر و نظر کا ماتم اس طرح کیا ہے

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے

ایک اور نظم میں اقبال نے ملت مرحومہ کو یاد دلایا۔ ؎

آتی ہے دم صبح صدا عرش بریں سے
کھویا گیا کس طرح ترا جوہر ادراک
کس طرح ہوا کند ترا نشتر تحقیق
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک

اور سب سے آخر میں ان تمام تہی سامانیوں اور کوتاہ دستیوں کا سبب بیان کرتے ہیں۔ ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

ذرا غور فرمائیے! آخر اس کا کیا سبب ہے کہ قرآن میں جبر و قدر کی جو آیات ہیں وہ صحابۂ کرام بھی پڑھتے تھے لیکن کبھی ان میں انتشار خیال پیدا نہیں ہوا اور اس بنا پر ان کے عملی جوش و خروش اور ولولہ جدوجہد پر اداسی طاری نہیں ہوئی۔ لیکن ہم ہیں کہ ہر قسم کی جدوجہد سے منہ موڑ کر تقدیر اور قسمت پر صابر و شاکر ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ دعا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی کرتے اور مانگتے تھے لیکن اس طرح کہ غزوہ بدر میں عین اسی وقت جب کہ معرکۂ کارزار گرم ہے سرِ مبارک بارگاہِ خداوندی میں جھکا ہوا ہے۔ اور آپ مصروفِ دعا ہیں۔ لیکن ہم ہیں کہ ہماری زندگی کے سارے کاروبار کا انحصار دعاؤں، خوابوں، تعویذ گنڈوں، نذر و نیاز، ختم بخاری اور قنوتِ نازلہ پر ہو کر رہ گیا ہے۔ اور پھر بھی یہ مرض بڑھتا رہا جوں جوں دوا کی۔ کا عالم ہے آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہمارے اسلاف نے قرآن مجید میں انسان کے لیے تسخیر کائنات کی آیات پڑھیں تو انہوں نے علوم و فنون کے خزانے کھنگال ڈالے لیکن ہم کو چاند پر انسان کے پہنچنے کی خبر ملتی ہے تو ہم متوحش اور سراسیمہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی توجیہہ کیا ہو سکتی ہے کہ اسلام کا اس کے دورِ ابتدا میں سابقہ دنیا کی بڑی بڑی تہذیبوں اور ثقافتوں سے پڑا لیکن کہیں اس کی گردن خم نہیں ہوئی۔ اور آج تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے فلسفہ و طراق نے اسے مرعوب اور خوفزدہ بنا دیا ہے۔ ان لوگوں کیا [illegible] کے سامنے مذہب اور سیاست، معاشیات اور تہذیب و تمدن

کے سینکڑوں ہزاروں نئے مسائل و معاملات آئے۔ انہوں نے سب کا جرأتمندانہ مقابلہ کیا اور ان کا حل بتایا۔ لیکن ہم ہیں کہ آج ہر نئی چیز سے ہم کو وحشت ہوتی ہے۔ اور آج تک ہم رویت ہلال، شخصی قوانین میں جزوی ترمیم و تنسیخ، بنک انٹرسٹ اور انشورنس وغیرہ جیسے مسائل کا حل تلاش نہیں کرسکے[1]
غور کیجیے تہی سامانی اور کوتاہ دستی کے ان حسرتناک مناظر و مشاہد کا واحد سبب بجز اس کے اور کیا ہے کہ ہم اسلام یعنی قرآن مجید، حدیث اور فقہ کا درس و مطالعہ کرتے ہیں۔ مگر فرقہ وارانہ ذہن کے ساتھ اور روایات و معتقدات کے حصار میں بند ہوکر۔ یہ طریقہ غیر معروضی ہے۔ ضرورت ہے کہ اب اسلام کا مطالعہ معروضی طور پر کیا جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس مطالعہ کا کیا طریقہ ہے۔ اور یہ کس طرح ہونا چاہیئے؟

گزارش یہ ہے کہ ایک شخص جب تیر اندازی کرتا ہے تو سب سے پہلے وہ شست باندھتا یعنی نشانہ سیدھا کرتا ہے۔ ورنہ کہنے والے کہہ دیتے ہیں کہ کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کرلو تیر کو۔ اس بنا پر ہمیں سب سے پہلے اپنا نقطۂ نظر (Approach) درست کرنا ہوگا۔ اور ہمیں یہ تسلیم کرکے کہ دین کی تکمیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کی حیات ہی میں ہوگئی تھی یہ تصور کرنا ہوگا کہ گویا ہم خود حضور کے عہد میں موجود ہیں۔ یا یہ کہ حضور خود ہمارے عہد میں تشریف فرما ہیں۔ اور قرآن کا نزول ہمارے سامنے ہو رہا ہے۔

اقبال نے جو کچھ کہا ہے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب　　گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

تو اس سے مراد یہی ہے۔ اس طرح ذہن کو ہر قسم کی کلامی، فقہی یا صوفیانہ عصبیت سے پاک و صاف کرکے اور براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ و استفاضہ کا انداز (Attitude) اختیار کرکے ہم کو قرآن، حدیث و فقہ کا درس و مطالعہ کس نہج پر کرنا چاہیئے!

۱. عنقریب خلا کا انسان چاند پر اپنی آبادی بسانے کا کام شروع کرنے والا ہے [illegible] آج تک رویت ہلال کے مسئلہ ہی سے نہیں کرسکے کہ ایک شہر کی رویت کس شہر تک معتبر ہوگی اور غیر ہے [illegible] جاسکتا ہے یا نہیں

۲. ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس　　ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے۔

© rasailojaraid.com



اب ہم نمبروار اس کو بیان کرتے ہیں۔ قرآن کے لیے حسب ذیل چیزیں ضروری ہیں۔

(۱) اس سلسلہ میں سب سے مقدم اور ضروری عربیت کا صحیح اور اصلی ذوق ہے جس کے باعث قرآن کے پڑھنے میں کم ازکم وہ لطف اور مزہ آئے جو ایک صاحب ذوقِ لطیف کو اپنی مادری ________ زبان کے کسی بہترین ادبی شاہکار کے مطالعے میں آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عجمی اقوام نے اسلام کی تصنیف و تالیف کی راہ سے جو خدمت کی ہے وہ عربوں ـ نے بھی نہیں کی، ممکن ہے یہ صحیح ہو تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ عجمیوں نے اسلام کو نقصان بھی بہت عظیم اور ناقابلِ تلافی پہنچایا ہے چنانچہ تصوف اور بھانت بھانت کے فرقے اور ان کی بولیاں بڑی حد تک عجم کی پیداوار ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ان لوگوں نے عربی میں لکھنا پڑھنا سیکھا لیکن عربیت قحہ کا مذاق پیدا نہ ہوا۔

(۲) قرآن کے الفاظ مفردہ کے اصل حقائق اور معانی کا فہم و ادراک، کیونکہ تہذیب و تمدن میں ترقی کے ساتھ ساتھ الفاظ کے معنی میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ یہی وہ تغیر و تبدل ہے جس سے ہمارے زمانہ کا ایک بالکل نیا علم (SEMANTIC STUDY OF WORDS) Meaning of The meaning یا Science of meaning بحث کرتا ہے قرآن کا مطالعہ کرتے وقت ہم کو یہ معلوم کرنا ہوگا کہ نزول قرآن کے وقت اس لفظ کا معنی و مفہوم کیا تھا

(۳) اسباب نزول قرآن اور قرآن کے اسالیب بیان سے حتی المقدور واقفیت: اس لئے کہ علم الاعراب اور علم الاسالیب یعنی المعانی والبیان میں بصیرت و مہارت۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی سیرت کا علم

(۵) عرب قبل اسلام اور عہد نبوی کی تہذیبی، تمدنی اور مذہبی تاریخ کا علم: حضرت عمرؓ سے ایک روایت ہے کہ اسلام میں جب کبھی ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو جاھلیۃ سے واقف نہیں ہوں گے تو وہ اسلام کا شیرازہ منتشر کردیں گے[۱] اس کی تائید میں متنبی کا مشہور مصرعہ وبضدھا تتبین الاشیاء بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

---

[۱] تفسیر المنار ج ۱ ص ۲۴



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



(۶) علم احوال البشر:۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں انسان کی پوری سرگذشت بیان کی ہے۔ کہ وہ کس طرح پیدا ہوا۔ اور اس نے تاریخ کے مختلف ادوار میں ہدایت و ضلالت کے کتنے مرحلے طے کئے ہیں اس کی مزاج اور طبیعت میں کیا کچھ تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے۔ اور اس پوری مدت میں سنت الٰہیہ کیا رہی ہے۔

(۷)، مطالعہ قرآن کے وقت دماغ کو علم کلام اور فقہ کی جزئی تفصیلات و تشریحات سے بالکل فارغ رکھا جائے۔

اس طرح کے مطالعے کی اگر مثال یا کوئی نمونہ درکار ہو تو ہم عصر جدید میں مصر کے مفتی محمد عبدہٗ اور سید رشید رضا کی تفسیر المنار اور ہندوستان کے مولانا عبدالحمید الفراہی اور آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تفاسیر کا نام لے سکتے ہیں۔

اب حدیث کو لیجیے، اس کے لیے امور ذیل کی رعایت ضروری ہے۔

۱۔ قرآن مجید کا ایک حصہ محکمات پر مشتمل ہے اور ایک حصہ متشابہات پر۔ اب جو احادیث محکمات قرآنی کے لیے تبیین کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور جمہور امت کے تعامل نے ان کو سند قبول بھی عطا کی ہے۔ وہ ہمارے نزدیک احادیث متواترہ کے حکم میں ہیں اور اس بنا پر وہ قطعی الثبوت قطعی الدلالہ اور واجب العمل ہیں۔

۲۔ احادیث کا مطالعہ کرنے کے وقت اسناد اور متن کی جرح تعدیل اور ان کی تحقیق و تنقید کے لیے علمائے جو اصول وضع کیے ہیں ان پر سختی سے عمل کیا جائے اور اس میں کسی کے ساتھ کوئی رو رعایت نہ برتی جائے۔

۳۔ مدارس عربیہ میں کتب حدیث کے درس کا اہتمام تو بہت ہوتا ہے لیکن ضرورت ہے کہ کتب جرح و تعدیل۔ اصول حدیث اور تاریخ تدوین و ترتیب حدیث اور محدثین کے حالات و سوانح اور ان کے نظام و مرتبہ کے ساتھ بھی خاطر خواہ اعتنا کیا جائے۔

۴۔ اور سب سے آخر میں مگر سب سے زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ مزاج و طبیعت نبوی سے



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



آشنا ہونے کی کوشش کی جائے ہم دیکھتے ہیں کہ لبا اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایک امر کے بابت ایک حکم ارشاد فرمایا۔ اور اسی کے متعلق کسی دوسرے موقع پر کوئی اور حکم دیا اس سلسلہ میں مزاج نبوی سے آشنا ہونے کے بعد ہم ان قدروں کا سراغ لگا سکیں گے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں ہیں۔ اور جن کے باعث حکم مختلف ہوگیا ہے۔ اسی طرح ہم دو مختلف حدیثوں میں مطابقت پیدا کر سکتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ان قدروں کی بنیاد پر جدید احکام بھی مستنبط کیے جا سکتے ہیں۔

اب رہا فقہ تو اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کی حیثیت ایک دستور constitution جیسی ہے اور احادیث جو احکام سے متعلق ہیں ان کی حیثیت اس دستور پر مبنی (Laws) کی ہے اور اس کے بعد مختلف مکاتب فقہ میں جو کچھ ہے اس کی حیثیت (BY LAWS) کی ہے جو کسی جماعت یا گروہ یا کسی خاص قسم کے احوال و ظروف زمانی و مکانی سے متعلق ہوتے ہیں۔ یا ان کی حیثیت PRECEDENTS یعنی نظائر کی ہے۔ اس بنا پر کسی ایک خاص مکتب فقہ کا اس طرح پابند ہو رہنا کہ کسی حالت میں بھی اس سے عدول نہ کیا جائے نہ شرعاً ضروری ہے اور نہ دنیا کے موجودہ حالات میں مناسب اور قابل عمل ہے علاوہ ازیں فقہ کے وسیع و عریض ذخیرہ اور اصول فقہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہونا چاہیئے کہ جن اصول و مناشی فقہ کی بنیاد پر فقہائے کرام نے احکام مستنبط کیے تھے ان کی روشنی میں ہم بھی جدید مسائل کے لیے احکام مستنبط کر سکیں یا جدید حالات میں ان پرانے احکام میں ہی حسب ضرورت و مصلحت کوئی مناسب ترمیم و تنسیخ کر سکیں۔ بشرطیکہ یہ احکام اپنی قانونی نوعیت و حیثیت کے اعتبار سے اس کی گنجائش رکھتے ہوں۔

ابن خلدون نے (المقدمۃ ص ۴۲۵) لکھا ہے کہ مغرب اور اندلس کے لوگ بداوت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور اس حضارت سے نا آشنا تھے جس سے عراق والوں کو سابقہ پڑا تھا۔ اس بنا پر وہ علمائے حجاز کی طرف زیادہ مائل اور راغب تھے اور اسی وجہ سے انہوں نے مذہب



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



مالکی کو اختیار کر لیا تھا۔ ابن خلدون کے اس قول سے ظاہر ہے کہ کسی ملک میں کسی ایک خاص مذہب فقہ کے قبول و رواج میں دخل اس ملک کے تہذیبی و تمدنی حالات کا بھی ہوتا ہے۔

ابن خلدون کے اس قول سے اشارہ اس بات کی طرف بھی نکلتا ہے کہ اگر تاریخ کے کسی دور میں دنیا کے کسی گوشہ میں مسلمانوں کو ایسے جدید تہذیبی و تمدنی حالات سے سابقہ پڑے جو فقہائے سلف کے عہد میں کہیں بھی موجود نہیں تھے۔ تو اس صورت میں علما کے لیے اس امر کی اجازت ہو گی کہ وہ فقہائے متقدمین کے اصول استنباط کی روشنی میں جدید احکام وضع کریں تاکہ الدین یُسْرٌ کی نعمت و ثروت سے یہ لوگ بھی فائدہ اٹھا سکیں

بہر حال اس مقصد کے پیش نظر ضروری ہے کہ مدارس عربیہ کے نصاب فقہ میں کسی ایک امام کا ہی نہیں بلکہ ائمہ اربعہ کا فقہ بھی اونچی جماعتوں میں پڑھایا جائے۔

اوپر جو تجاویز پیش کی گئی ہیں اگر ان پر عمل کیا گیا تو اس طرح ہم اسلام کا معروضی مطالعہ کر سکیں گے اور اس سے خود ہم کو فائدہ پہونچے گا اور دوسروں کو فائدہ پہونچا سکیں گے۔"

---

نمبر ۱۔ ادارہ ندوۃ المصنفین کے زیادہ سے زیادہ ممبر بنئے آپ کو اس طرف خصوصی توجہ دلائی جاتی ہے۔

نمبر ۲۔ اور برہان ایک معیاری رسالہ ہے۔ اس کے خریدار بنئے سالانہ چندہ ۱۰/=

نوٹ:

مدت خریداری و مدت ممبری ختم ہوتے ہی رقم کا منی آرڈر بھیج دیا کریں۔ اور یہ تاکید ہے کہ منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ لکھا کریں۔ یہ نہایت ضروری ہے



© rasailojaraid.com